# میکانکی اسلام

از جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز

سامنے میز پر گھڑی رکھی تھی شیشہ ٹوٹا ہوا اور منٹ کی سوئی غائب۔ گھنٹے کی سوئی پر میری نگاہ تھی اور میں ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے اس میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی لیکن میرے سامنے ہی سامنے وہ ایک دو اور دو سے تین تک پہنچ گئی۔ میں نے سوچا کہ بعض تغیرات ذہن انسانی میں بھی کچھ ایسے تدریجاً اور غیر شعوری طور پر رونما ہوتے ہیں کہ جب تک انکا مجموعی اثر ایک نمایاں انقلاب کی شکل میں ظاہر نہیں ہو جاتا یہ محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ عمل میں آ رہا ہے۔ ذہنی انقلاب کے یہ تخریبی و تعمیری مراحل دریا کی پرسکون روزیوں کی طرح کچھ ایسے غیر مرئی طور پر طے پا جاتے ہیں کہ جو خطوط ابتداءً زیادہ سے زیادہ نقوش آب کی حیثیت رکھتے تھے وہی ایک عرصہ کے بعد ایک محکم حصار سنگین کی بنیادیں بن جاتے ہیں۔ ریگستانوں میں آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ صبح ایک صاف و ہموار میدان سامنے تھا شام کو وہاں ریت کا بہت بڑا ٹیلہ کھڑا ہو گیا۔ اور خواہ آپ دن بھر وہاں بیٹھے دیکھتے رہیں کبھی معلوم نہ کر سکیں گے کہ یہ رد و بدل کس انداز سے عمل میں آ رہا ہے

مغرب کی مادیت کا ایک اثر تو وہ تھا جو آتش فشاں دھماکے کے ساتھ مشرق میں رونما ہوا جسے اندھوں نے دیکھا اور بہروں نے سنا یعنی مذہب سے تنفر و بیزاری کا اعلان بیانگ دھل کیا گیا لیکن اس سے کہیں گہرا کہیں مہیب اور کہیں زہریلا وہ اثر تھا جو گھڑی کی سوئی کی طرح ظاہر ہوا اور جسے تیز سے تیز نگاہ بھی مشکل بھانپ سکی۔ یہ اثر ان قلوب پر مسلط ہوا جو اگرچہ سعادت و نجات کی راہ مذہب ہی میں سمجھتے تھے لیکن مغربی معقولیت کی حدود بندی نہ کر سکے اور وہ آہستہ آہستہ ان کی سرحد ایمانیات میں بھی گھس گئی۔ اور اس کا زہر ان کے معتقدات کے رگ و پے میں اس خاموشی سے سرایت کرتا چلا گیا کہ آج اگر ان کے مذہبی اصولوں کا بغور مطالعہ کیا جائے

تو معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو وہ آج مذہب کہہ رہے ہیں اسے مذہب سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا زمین کو آسمان سے۔ یہ معقولیت پسندوں کی جماعت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اور ان کا مشن یہ ہے کہ مذہب کے اصول ان کی اپنی عقل کے مطابق، یا زیادہ سے زیادہ حکماء یورپ کی عقل کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یہاں ان کے معتقدات کا استقصاء مقصود نہیں لیکن مجملاً یوں سمجھئے کہ:۔

۱۔ خدا ان کے نزدیک ایک ایسی قوت کا نام ہے جو کائنات کے اولین سامانات کی تخلیق کی موجب ہوئی۔ اس کے بعد مخلوقات عالم نے اپنے ارتقائی نشو و نما کی منازل طے کر کے اتفاقیہ ایک مستقل نظام کی صورت اختیار کر لی جو ایک غیر متبدل اور اٹل قانون کی شکل میں خود بخود چل رہا ہے۔ اور خدا ایک عضو معطل کی طرح الگ بیٹھا اس کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس کارگہ حیات میں نہ اس کا کچھ فعل ہے نہ ارادہ۔ دنیا چونکہ عالم اسباب ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کامیابی کو اپنی قوت بازو اور حسن تدبیر کی رہین منت سمجھتے ہیں۔ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ (۲۹: ۵) اور اگر کہیں ناکامی ہوتی ہے تو علت و معلول کی کڑیوں کا معائنہ شروع ہو جاتا ہے، اور اگر کبھی وہ ڈور کچھ ایسی الجھی ہو کہ سرا نہ ملے تو بجائے علت العلل کی طرف نگاہ جانے کے اس ناشدنی واقعہ کو "اتفاق" کے مجہول الکیف نام سے معنون کر دیتے ہیں۔ غرض زندگی کے کسی شعبہ میں، کاروبار حیات کے کسی گوشہ میں انہیں خدائی ہاتھ کارفرما نظر نہیں آتا۔ اور اگرچہ ہر روز ایاک نستعین سے اس کا زبانی اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً نہ وہ خدا کی مدد پر بھروسہ رکھتے ہیں نہ کسی کام میں اس کی طرف سے خیر و برکت پر ان کا ایمان ہوتا ہے۔

۲۔ رسول کا تصور ان کے نزدیک ایک سیاسی لیڈر، ایک مصلح قوم کا سا ہوتا ہے جو اپنی قوم کی نکبت و زبوں حالی سے متاثر ہو کر انہیں فلاح و بہبود کی طرف بلاتا ہے۔ اپنی تدبیر و مصلحت اندیشی سے وہ قوم کی بکھری ہوئی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ان کی تلواروں کے رخ جو اس سے قبل ان کے اپنے قبائل کی سمت ہوتے تھے دشمنوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اندر انضباط و ایثار کی روح پھونک کر زمین کے

بہترین خلقوں کا انہیں مالک بنا دیتا ہے۔ اس کی حقیقت قوم کے ایک امیر کی سی ہوتی ہے ۔ جس کے ہر حکم کا اتباع اس لئے لازمی ہوتا ہے کہ انحراف سے قوم کی اجتماعی قوت میں انتشار پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور وہ دنیاوی نعمتیں جو اس کے حسن تدبیر سے حاصل ہوئی تھیں ان کے چھن جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اس کا حسن تدبر عقل و حکمت، ذہن انسانی کے ارتقار کی بہترین کڑی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول کا بہترین مفکر شمار کیا جاتا ہے۔ کثرت ریاضت سے بُرائی کی قوتیں اس سے سلب ہو جاتی ہیں۔ اور نیکی کی قوتیں نمایاں طور پر ابھر آتی ہیں۔ انہی قوتوں کا نام ان کے نزدیک ابلیس اور ملائکہ ہے۔

۳۔ قرآن کو وہ ایک بہترین کتاب سمجھتے ہیں صرف اس حیثیت سے کہ اس میں دنیاوی معاشرت کے بہترین اصول مندرج ہیں جس پر کاربند ہو کر مسلمان غلبہ و استیلار کی زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن ایمان کے اس حصہ کے باوصف وہ دنیا کی ہر نئی تحریک کی طرف بڑی بے تابی سے لپکتے ہیں، اور ہر نئی "ایت" اور ہر نئی "ازم" میں اپنی مصیبتوں کا علاج تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے نزدیک قرآن کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ مغربی حکمار کے نظریوں کی تائید کرتا چلا جائے اس لئے ان کی تمام تر کوشش اسی "جہاد" میں صرف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو ہر نئی تحریک کے مطابق ثابت کر دیا جائے ۔ اگر طبیعت میں کہیں ادبی ذوق ہوا تو وہ قرآنی فصاحت و بلاغت کا موازنہ دنیائے شاعری کی کتابوں سے کرنے لگ جاتے ہیں[۱] غرض کہ قرآن کو وہ اسی ماحول کی پیداوار اور اسی زمین کی شاعری سمجھتے ہیں ۔

۴۔ مکافات عمل پر ان کا ایمان ہے لیکن اس شکل میں کہ وہ اسی دنیا کو دار العمل اور اسی کو دار الجزا سمجھتے ہیں۔ جنت و دوزخ کا وجود ان کے نزدیک خود قلب انسانی کے اندر ہی ہے ۔ دل کے سکون و طمانیت کا نام جنت۔ اور اس کے اضطراب کی سوزش پنہاں کا مفہوم جہنم ۔ معاد بھی ان کے نزدیک اپنی قلبی کیفیات کا نام ہے اور حشر سے مقصد ان حیات کا تیز تر ہو جانا ہے۔

[۱] معیار کی یہی غلطی تھی جس کی وجہ سے مصر کے مشہور آزاد خیال مسلم ادیب کی نظر میں ح کی کتاب سحر الفن القرآن بھی بڑی ہی بری معلوم ہوئی ۔ پرویز

۵۔ ایمانیات کے بعد اعمال و عبادات میں بھی ان کے نظریے کچھ ایسے ہی مصالح پر مبنی ہیں۔ نماز ایک اچھی عبادت ہے لیکن محض اس لئے کہ اس سے پابندی اوقات اور صفائی جسم کی عادت پڑ جاتی ہے۔ باقی رہا خدا کے ساتھ تعلق سو اس کے لئے ان کے نزدیک کسی مخصوص شکل کی ضرورت نہیں۔ دنیاوی مشاغل، دفتر کی فائلوں سے تھک کر کرسی سے جھک کے میز پر سر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور بس دل خدا تک پہنچ گیا۔ نماز باجماعت۔ جمعہ۔ عیدین میں صرف ایک اجتماعی منظر دکھلانا مقصود ہے۔ اور حج ان کے نزدیک ایک "آل ورلڈ مسلم کانفرنس" (مؤتمر عالم اسلام) سے زیادہ نہیں۔ زکوٰۃ کی جگہ قومی چندے بہترین نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ روزے سے مقصود طبیعت کو "سپاہیانہ عادت کا خوگر بنانا (یا اکھڑ بدوؤں کے اشہب عنان گسیختہ کی صیامت) تھا۔ قربانی کی بے فائدہ خونریزی ان کے نزدیک کسی اور شکل میں تبدیل ہو کر بہترین افادی نتایج پیدا کر سکتی ہے۔ اور تو اور۔ جہاد۔ جو درحقیقت اسلام کا دوسرا نام ہے ان کے نزدیک محض تگ و دو حیات میں سعی و کوشش کا نام ہے۔ اور آج کل کونسلوں میں چند نشستیں مخصوص کرا لینا اس فریضۂ عظیم کی سرانجام دہی کی بہترین صورت ہے۔

ایک جملہ میں یوں سمجھئے کہ مذہب ان کے نزدیک اسی زمین سے متعلق ہے اور "آسمان" سے کچھ علاقہ نہیں۔ یہ "میکانکی اسلام" روح اور روحانیت سے اتنا ہی نا آشنا ہے جتنی یورپ کی مشینیں جذبات سے عاری۔

(۰)

آیئے اب ان معتقدات کو قرآن کی روشنی میں دیکھیں۔

۱۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ "کارگہ عالم ایک خاص نظام کے ماتحت چل رہا ہے جسے قانون فطرت کہتے ہیں اور جو بالعموم غیر متبدل اور اٹل ہوتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵: ۵) — اور تو اللہ کے دستور کو بدلتا ہوا اور ٹلتا ہوا نہیں پائے گا۔

لیکن یہ قوانین و نظام خود بخود اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آگئے۔ بلکہ ایک حکیم ازلی کے ارادہ و مشیت کے ماتحت وضع ہوئے ہیں، جو ان قوانین کے نافذ کرنے کے بعد خود بے بس و مجبور ہو کر نہیں گیا ہے۔

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۔ وَ عِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ (۳:۶) اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے، اور جو چاہتا ہے ثبت کرتا ہے۔ اس کے پاس ام الکتب ہے۔

کون و مکان کے ایک ایک ذرہ میں اس کی مشیت و قدرت کارفرما ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (۱۱: ۹) بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (۵: ۱) حکم کرتا ہے۔

ہر چند کہ یہ مشیت بھی اس کی حکمت و قانون پر مبنی ہے جس کو قوانین قدرت کہتے ہیں لیکن ان قوانین کی کنہ و حقیقت ذہن انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔ دنیا کا کوئی دماغ یہ نہیں بتا سکتا کہ شہد میٹھا اور حنظل تلخ کیوں ہے؟ دنیا کو یہ نظام اُسی نے عطا فرمایا ہے اور اس نظام میں تمام امور اُسی کے حکم و ارادہ سے سرانجام پاتے ہیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۶۵: ۲) وہ اللہ ہی ہے جس نے سات بلندیاں اور ان کی مثل پستیاں پیدا کیں ان سب میں اس کا حکم اترتا رہتا ہے تاکہ تم یقین کرلو کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ حصول مقاصد کے لئے جدوجہد انسان کے لئے لازم ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳: ۳) اور اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضایع نہیں کرتا۔ بشرطیکہ نیت بخیر ہو۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانی مساعی و محنت کا نتیجہ بھی اسی شکل۔ اسی نوعیت۔ اسی عرصہ اور مقدار میں مرتب ہو جو خود انسان نے اپنے ذہن میں مقرر کر رکھا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص بالعموم یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات میں ایک فرد مکمل اور آزاد

ہے۔ Independent Unit ہے۔ لہٰذا امور عالم کا تعین اس کی آرزوؤں کے مطابق ہونا چاہئے اور اس کے اعمال و افعال کا اثر بھی اس کی ذات تک محدود رہنا چاہئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد واحد اس کارخانہ عالم میں عظیم الشان مشنری کا ایک ادنیٰ سا پرزہ ہے۔ جس کی ایک ایک جنبش کا اثر تمام مشنری اور تمام مشنری کی حرکات کا اثر اس پرزہ پر پڑتا ہے اور یہ تمام سلسلہ ایک مشیت کے ماتحت کسی خاص مقصد کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اس لئے اگر ہر انسان کی دنیا اس کی آرزوؤں کے مطابق ڈھل جائے تو نظم و نسق عالم چند دنوں میں تہ و بالا ہو جائے۔ کبھی غور فرمایا کہ آج دنیا میں اس قدر اضطراب و بے تابی یہ عدم طمانیت و فقدان سکون کیوں ہے؟ کیا محض اس لئے نہیں کہ ہر شخص اپنا مقصد حیات خود متعین کئے بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ کھینچ تان کر دنیا اس کی اپنی تمناؤں کا گہوارہ بن جائے

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸: ۵) اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر محض اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔

ثانیاً انسان کو چونکہ مستقبل کا علم نہیں دیا گیا۔ اس لئے یہ ضرور نہیں کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے بہتر تصور کرتا ہے وہ فی الواقع اس کے لئے بہتر ہی ثابت ہو۔ اس کا صحیح صحیح علم علام الغیوب کے پاس ہے۔ کیونکہ

عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲: ۲۷) یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو لیکن وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور تم ایک چیز پسند کرتے ہو لیکن وہ تمہارے لئے بری ثابت ہو اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

لہٰذا قوانین فطرت کے دائرے کے اندر کوشش اور جد و جہد یقیناً فرض ہے لیکن اس کوشش کے بعد ترتیب نتائج کے لئے مشیت ایزدی پر ایمان رکھنا بھی لازمی ہے۔ کامیابی و ناکامی میں سلسلہ علت و

معلول کا تجزیہ بھی ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آخری نگاہ۔ اس علت العلل۔ اس مسبب الاسباب
ذات پر رکھنی بھی ضروری ہے جس نے علت کو علت اور معلول کو معلول بنایا۔ اس لئے کہ علت و معلول
کی حقیقت بھی انسان کو اس سے زیادہ کیا معلوم ہے کہ۔ بقول امام غزالیؒ ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔
بہترین اسباب و وسائل بہترین قوتیں اور اپنی سمجھ کے مطابق بہترین ذرائع بہم پہونچانے ضروری ہیں۔
لیکن ان سب کے بعد یہ ایمان بھی ضروری ہے کہ۔

اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ۔ (۴۰:۵) میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یقیناً اللہ اپنے بندوں کا نگران ہے۔

۲۔ رسول بلاشبہ مصلح اور مدبر ملت ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت دنیاوی مصلحین و مدبرین سے
بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ دنیاوی مفکرین و مدبرین اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور ان کا فلسفۂ
اصلاح و بہبود ان کی اپنی پرواز فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو کبھی صحیح اور کبھی غلط ہوتا ہے۔ برعکس اس کے انبیاء
کرام مامورمن اللہ ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ اس دنیا میں خاص مشیت باری تعالیٰ کے ماتحت چلتا ہے۔
وہ نہ اپنے ماحول سے متاثر اور نہ احوال و ظروف کے پیداوار ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کا انتخاب مملکت ایزدی
سے ہوتا ہے۔

اَللّٰہُ یَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ (۶:۱۲۵) اللہ خوب جانتا ہے کہ کسے اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا جائے
اور ان کا سرچشمۂ علوم و ہدایت علم باری تعالیٰ ہوتا ہے جس میں کسی سہو و خطا کی گنجائش نہیں
ان کا سینہ علوم لدنی سے معمور اور ان کا قلب تجلیات نورازلی سے منور ہوتا ہے۔ دنیاوی سیاست و
تفکر ایک صفت ہے جو اکتساباً حاصل ہوتی ہے، اور مشق و مہارت سے یہ ملکہ بڑھتا ہے لیکن نبوت ایک
موہبت ربانی اور عطائے یزدانی ہے جس میں کسب و مشق کو کچھ دخل نہیں۔ قوم و امت کی ترقی
ان کے بھی پیش نظر ہوتی ہے لیکن سب سے مقدم اخلاق انسانی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے حقیقت یہ ہے

ان کی تعلیم و تعمیل کا انداز ہی کچھ ایسا نرالا ہوتا ہے کہ تزکیہ نفوس و قلوب کے ساتھ ساتھ ذہن میں جِلا اور بازو میں قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور اس سے ایک ایسی قوم کی تشکیل عمل میں آتی ہے جس کے دائیں ہاتھ میں آسمان کی بادشاہت اور بائیں میں زمین کی مملکت ہوتی ہے۔ اس کا پیغام زمان و مکان کی قیود سے بالا ہوتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو راستہ دکھانے والا۔ اور قیامت تک کے لئے مطاع ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا ... وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ (۶۲:۱)

وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو آیتیں سناتا ہے ان کا تزکیہ نفوس کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اور ان لوگوں کی طرف بھی جو ابھی تک ان میں نہیں ملے۔

اس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت اور اس کی معصیت خدا کی معصیت ہوتی ہے۔

وَمَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (۴:۱۱) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی

اور جو لائحہ حیات اس کی وساطت سے دنیا کو ملتا ہے۔ اس میں کوئی دنیاوی طاقت رد و بدل نہیں کر سکتی بلکہ دنیا بھر کی عقول میں جہاں کہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ بھی اسی کی مشعل ہدایت سے ہو سکتا ہے۔

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (۴:۸)

اگر کسی بات میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

ان کو خدائی پیغام ملائکہ کی وساطت سے ملتے ہیں۔ جو اگرچہ عالم امر سے متعلق ہونے کی وجہ سے سرحد ادراک انسانی سے بالاتر ہیں لیکن ان کا وجود محض انسان کی ملکوتی قوتیں نہیں ہیں۔

يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۱۶:۱)

وہ فرشتوں کو اپنے حکم سے وحی دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے بھیجتا ہے۔

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَ

اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے (جسے چاہتا ہے)

مِنَ النَّاسِ (۲۲ : ۱۰)　　بطور رقاصد چن لیا ہے۔

اسی طرح سے ابلیس بھی محض طاغوتی قوتوں کا نام نہیں۔ بلکہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ　　ابلیس نے کہا کہ میں اس (آدم) سے بہتر ہوں مجھے تو نے

خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۳۸ : ۵)۔　　آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے۔

۳۔ بلاشائبہ تشکیک قرآن ایک کتاب آئین ہے جس کے اصولوں پر کاربند ہو کر ایک قوم اعلیٰ ترین زندگی بسر کر سکتی ہے لیکن اس کی تعلیم کا مقصد وحید محض دنیوی غلبہ و استیلا ہی نہیں بلکہ یہ تو محض فرعی اثمار ( Bye-Products ) ہیں۔ اس کی اصل تو انسان کو ان مقاصد عالیہ کے حصول کا راستہ دکھانا ہے جو تخلیق آدم کی اصلی غایت ہیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ　　بیشک یہ قرآن وہی راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ

(۱۷ : ۹)　　سیدھی ہے۔

قرآنی تعلیم کی رو سے انسان محض اسی دنیا کا جانور نہیں ہے۔ کہ یہاں کی آرائش و زیبائش ہی اس کی اصل زندگی اور مقصد حیات قرار پا جائے بلکہ دنیا تو اس کی منازل حیات کا ایک دھندلا سا تصور اور اس کے شجر زندگی کی ایک تخمی سی شکل ہے۔ تخم میں شجر کا محض ایک تخیل سا نظر آتا ہے بار آوری کی صلاحیت اس میں نہیں ہوتی یہی تخم ایمان و عمل کی آبیاری سے آیندہ زندگی میں شجر کی صورت اختیار کرے گا۔ اسلام نے ایمان و عمل صالح کے نتائج میں سے دو چیزیں قرار دی ہیں۔ ایک تو یہ کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا　　اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان

الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴ : ۷)　　لائے اور عمل صالح کئے انہیں وہ زمین میں خلافت عطا فرمائیگا

دوسرے یہ کہ :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ　　ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے اللہ نے

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (۵:۲) وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

باوصف اس امر کے کہ اس دنیا میں عزت و وقار غلبہ و استیلا کی زندگی کا وعدہ ایمان و عمل صالح سے مشروط کر رکھا ہے۔ قرآن بار بار اس امر پر زور دیتا ہے کہ کہیں مقصود بالذات اس دنیا کی زندگی کو قرار نہ دے دینا۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ دنیا کی یہ زندگی تو ایک کھیل تماشے سے زیادہ نہیں
وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹:۷) فی الحقیقت زندگی کی جگہ تو آخرت ہے۔ [1]

ہاں تو قرآن۔ انسان کو اس زندگی کے لئے تیار کرتا ہے۔ جو زندگی کہلانے کی مستحق ہے۔

اس کے اصول ایسے اٹل اور اس کی بنیادیں ایسی محکم ہیں کہ دنیا کے نظریے بنیں اور بگڑیں انکشافات پیدا ہوں اور مٹ جائیں لیکن اس کے حقائق روشنی کے مینار کی طرح مستحکم کھڑے ہیں کہ انقلابات ذہنی کی موجیں اٹھیں اور ٹکرا ٹکرا کر معدوم ہو جائیں

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (۱:۱۱) ایک کتاب۔ جس کی آیتیں پختہ بنائی گئی ہیں۔

قرآن کے لئے یہ بات ذرا بھی قابل فخر نہیں کہ دنیا کی کوئی "ازم" اور کوئی "ایت" اس کی تعلیم کے مطابق ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۔ (۶۹:۲) وہ تو حق الیقین ہے۔

بلکہ یہ بات خود اس "ازم" اور "ایت" کے لئے طرۂ امتیاز ہوگی کہ بارگاہ قرآنی سے اس کے

---

[1] اگرچہ قرآن حکیم میں حیات انسانی کے منتہی کی نسبت کھلے کھلے الفاظ میں صراحت نہیں کی گئی لیکن بعض اشارات سے پتہ چلتا ہے کہ جنت بھی۔ جو بالعموم منزل مقصود سمجھی جاتی ہے۔ درحقیقت اصل منزل مقصود نہیں بلکہ راستہ کا ایک خوشنما منظر ہے۔ چنانچہ اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے۔ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (۲۲:۳) اور جنتیوں کو پاکیزہ قول کی ہدایت کی جائیگی اور صراط حمید کی راہ دکھائی جائے گی۔ پھر ان کی یہ دعا قرآن میں موجود ہے:۔
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (۲۶:۲) کہیں گے اے اللہ ہمارے نور کی تکمیل کر دے۔
پھر منتہی کیا ہے؟۔ یہ راز۔ راز ہی رہے تو اچھا ہے۔ غم دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد۔ بہرکیف اسی دنیا کو منتہی قرار دے لینا تو بڑی تنگ ظرفی ہے۔ پرویز

حق میں تائید ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ یہ

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (۲: ۲۴)
جملہ انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل میں فرق کرنے کی دلیلیں ہیں۔

دنیاوی اصول خاص خاص قوموں کے لئے اور ان کے بھی خاص خاص حالات کو پیش نظر رکھکر وضع کئے جاتے ہیں لیکن قرآنی اصول قیامت تک کے لئے نافذ العمل اور دنیا بھر کے انسانوں کے لئے شمع ہدایت ہیں

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۸۱)
یقیناً یہ تمام اہل عالم کے لئے ہدایت ہے۔

۴۔ ہاں یہ بھی درست ہے کہ بعض اعمال کی سزا یا جزا اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔

لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ۔ (۱۰: ۱۰)
جب یہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیوی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے دور کر دیا اور انھیں کچھ مدت کے لئے سامان حیات دیدیا۔

لیکن اصل دار المکافات اخروی زندگی ہی ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۹۷-۶۶)
صاحب ایمان مرد و عورت میں سے جو کوئی بھی عمل صالح کرے گا اسے ہم (اس دنیا میں) حیاتِ خوشگوار عطا فرمائیں گے۔ اور ان کے ان بہترین اعمال کا اجر اخروی (دنیا میں بھی) دیں گے۔

اس سے بھی واضح تر یہ ارشاد ہے:۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ (۱۳: ۵)
کفار کے لئے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا تمام تر عمل اور ابتلاء کا مقام ہے تخم ریزی اور بار آوری میں جو لازمی وقفہ چاہیئے

وہ پورا کرنے کے لئے ایک وقت معین تک مہلت دی جاتی ہے۔ اور حقیقی بار آوری کا وقت حیات اخروی ہی ہے

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى۔ (۱۶: ۸)

اگر اللہ انسانوں کو ان کے ظلم کے بدلے میں فوراً گرفتار کرلیتا۔ تو زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہتا لیکن وہ ان کو مہلت دیتا ہے ایک وقت معین تک۔ [۱]

یہ بھی صحیح ہے کہ اطمینان قلب بڑی چیز ہے اور نعماء جنت میں سب سے بڑی نعمت نَفْسِ مُطْمَئِنَّہ ہے نیز اضطراب قلبی بھی ایک سخت عذاب ہے لیکن جنت و دوزخ اور معاد کی تمام تفصیلات کو جو قرآن میں مذکور ہیں محض قلب انسانی کے اندر محیط کر دینا بھی درست نہیں۔ دوسری زندگی کے متعلق قرآن میں بڑی تکرار واعادہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ احیاء بعد الموت کے متعلق ارشاد ہے۔

كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ (۲: ۲) تم مردہ تھے پھر تمہیں اللہ نے زندہ کیا۔ پھر وہ تمہیں مارے گا پھر زندہ کرے گا

یہ پیدائش کیسی ہوگی؟ ارشاد ہے:۔

كَمَا خَلَقْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ (۲۱: ۷) جس طرح ہم نے پہلی بار پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ بھی پیدا کریں گے

اس میں شبہ نہیں کہ نعمائے جنت اور عقوبات جہنم کی تفاصیل تمثیلی رنگ میں بیان ہوئی ہیں کیونکہ یہ مابعد الطبیعات سے متعلق ہیں لیکن اس تمام تفصیل کے ایک ایک جزء پر ہمارا ایمان اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح قرآن میں ان کا ذکر موجود ہے۔ اور جس حقیقت کا راز خود اللہ تعالیٰ نے نہیں کھولا اس پر تاویلات سے قطعیت کا حکم نہیں لگانا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے اور کس قدر زور دار الفاظ میں کہتا ہے کہ۔

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ۔ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ (۵۱: ۱)

آسمان وزمین کے پروردگار کی قسم قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایسا ہی حقیقی واقعہ ہے جیسا تمہارا باتیں کرنا واقعہ ہے۔

---

[۱] اور یہ وقت معین ہے روز محشر کا۔
اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ۔ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (۲: ۱۷) آج کے دن (یوم محشر) ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائیگا آج کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

۵۔ یہ بھی درست ہے کہ عبادات میں بدنی اور معاشرتی مفاد بھی ساتھ ہی ساتھ آجاتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں کہ ان عبادات سے مقصود بالذات یہی بدنی و معاشرتی مفاد ہیں۔ انسان کے ساتھ مختلف تعلقات وابستہ ہیں۔ ایک خالق کا۔ ایک اپنے نفس کا اور ایک مخلوق کا۔ اسلامی احکام میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ ان کی بجاآوری میں بیک وقت ہر سہ فرائض کی ادائگی ہو جاتی ہے۔ یعنی رضائے مولیٰ حفظ نفس اور ہمدردی خلائق کا حصول ایک ہی عبادت کی سرانجام دہی میں ہو جاتا ہے اور یہی ہم آہنگی ہے جو اسلامی احکام کے سوا اور کہیں نظر نہ آئے گی ان میں مقدم خوشنودی باری تعالیٰ ہے اور یہی چیز ہے جسے تقویٰ کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی بغیر کسی قسم کی ذاتی غرض و منفعت کو پیش نظر رکھنے کے محض اس خلوص نیت سے کہ جو کچھ کر رہا ہوں محض خدا کے کر رہا ہوں عمل کرنا روح اسلام اور تقویٰ کا مدعا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ کہدے کہ میری نماز۔ میری قربانیاں۔ میری زندگی میری موت سب اللہ کیلئے ہے۔

یہ ہے نقطۂ ماسکہ تمام عبادات و اعمال اسلامی کا۔ اگر کوئی عمل اس معیار پر پورا اترتا ہے تو اس کے لازمی نتائج و ثمار خواہ اپنی ذات کے لئے ہوں خواہ مخلوق کیلئے سب حلال و طیب لیکن اگر اس کے خلاف ہو تو وہ عمل لاکھ منافع در آغوش کیوں نہ ہو سب حرام و خبیث۔ نماز کے متعلق یہ کہدیا کہ۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔ نماز فواحش اور برائیوں سے روکتی ہے۔

لیکن اس مرکز کو سامنے سے نہیں ہٹنے دیا کہ۔

اِنَّهَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ بیشک نماز گراں گزرتی ہے لیکن ان لوگوں پر نہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں

روزہ فرض کرتے وقت اول و آخر یہ ارشاد فرمایا کہ۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

زکوٰۃ کی دنیاوی منفعتوں سے گو انکار ہے لیکن علت غائی وہی ہے کہ:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ — ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو اور اس طرح ان کے اموال وقلوب کو مطہر و پاکیزہ بنا دو۔

اور ساتھ ہی یہ تہدید بھی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (۴:۶۰) — اور اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے مال کو محض دکھاوے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے

گویا ریاء اور کفر مترادف ہیں —

حج اور قربانی میں بھی یہی علت کارفرما ہے کہ یہ دونوں شعائر اللہ کو قائم رکھنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال کہ چونکہ مقصود ان عبادات سے دُنیوی منافع ہیں اس لئے یہ مقاصد کسی اور شکل میں حاصل کر لئے جائیں یکسر غلط اور گمراہ کن ہے مقصد اولیٰ ان سے تقویٰ اور مرضات اللہ ہے اور یہ محض اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے متعین فرما دی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا رد و بدل قطعًا ناقص ہے۔

قوم کی اقتصادی و معاشرتی اصلاح اور سیاسی و تمدنی زندگی کے بقا کے لئے جو قدم بھی اٹھایا جائے لائق صد تحسین ہے۔ اس لئے کہ ذلت اور رسوائی کی زندگی قرآن کی رو سے غضب الٰہی کی نشانی ہے

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ — ان پر ذلت و مسکینی کی مار ماری گئی اور وہ اللہ کے غضب میں آ گئے

اور عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا عین امتیاز ایمان ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (۶۳:۱) — عزت تو بس اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے

یہی نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح کا لازمی نتیجہ خلافت فی الارض ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے محض دنیا کے کسی مقصد کا حصول۔ خواہ وہ کتنا ہی جلیل المنزلت کیوں نہ ہو۔ مسلمان کی مساعی و توجہ کا

آخری نقطہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا مقصد تو دنیاوی عروج کے ساتھ ساتھ تقویٰ کا حصول بھی ہے۔ لہٰذا جس پروگرام میں محض دنیا ہی دنیا ہو اور تقویٰ اور تزکیۂ قلوب کا خیال نہ رکھا گیا ہو وہ خدا کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اسی تقویٰ کے بے غرض قربانی۔ ایثار لمرضات اللہ کا نام جہاد ہے۔ خواہ اس کے لئے ایک قدم اٹھانا پڑے یا جان تک بھی دینی پڑے۔

حکایت دراز تر ہو گئی اس لئے ان اسباب و ذرائع کی تفصیل کو نظر انداز کرتا ہوں جو اس تجدد و مذہب کے موجب بنتے ہیں لیکن ان میں سے ایک اہم ترین سبب کا ذکر نہایت ضروری ہے اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دورِ جدید کی اسلامی معلومات کا ماخذ قرآن و سنت نہیں بلکہ مستشرقین مغرب کی تصانیف ہیں اور یہی سب سے بڑی وجہ اس ذہنی انقلاب کی ہے ان مستشرقین کے علمی احسانات اسلام پر خواہ کسی قدر کیوں نہ ہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یا تو شائد اس لئے کہ وہ خود اس علم تک نہیں پہنچ سکے، یا دانستہ، بہرکیف وہ اسلام کے متعلق جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس زاویہ نگاہ سے لکھتے ہیں کہ اسلام کو ایک کامیاب "ارضی تحریک" ثابت کر دیا جائے۔ وہ یورپین مصنف جنہوں نے حضور نبی اکرم صلعم کی ذاتِ گرامی کے متعلق حسن عقیدت کا اظہار کیا ہے ان کے خیالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بھی کھل جائے گی کہ انہوں نے حضور صلعم کو زیادہ سے زیادہ ایک دنیاوی مصلح۔ کامیاب لیڈر۔ اور اولوالعزم فاتح کی حیثیت سے سمجھا ہے یا پیش کیا ہے یہی حال قرآن کے متعلق ان کے خیالات کا ہے۔ ایک تو ہم ویسے ہی ان مستشرقین کی تحقیقات علمی سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ پھر ان کا انداز بیان کچھ ایسا ساحرانہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان کی تعلیم ہم پر پورا پورا اثر کر دیتی ہے اور ہم اسلام کو انہی کی عینک سے دیکھنے لگ جاتے ہیں[1]۔ ایمانیات کا صحیح ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر ایک مسلم کی دینی و دنیوی عمارتیں استوار ہوں گی۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم خالی الذہن ہو کر مذہب کا مطالعہ کتاب اللہ اور اسوۂ رسول اللہ کی روشنی میں کریں اس سے یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ اسلام کے پیش نظر جہاں "کلیسا کے راہب" پیدا کرنا نہیں وہاں محض سکندر اعظم بھی اس کا مطمح نگاہ نہیں۔ وہ ان دونوں کے امتزاج سے "عمر فاروق" کا معیار تیار کرتا ہے۔ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ

---

[1] ان محققین کی ریسرچ محض قیاسیات پر مبنی ہوتی ہے جس کے اتباع کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ۔

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۔ (۶:۱۱۶)

اگر تو دنیا کے اکثر لوگوں کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور محض ظن و تخمین سے کام لیتے ہیں۔

اور قرآن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ۔

إِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ۔ (۶۹ : ۲) یقیناً وہ حق الیقین ہے۔ (ظن و قیاس نہیں) پرویز۔